فارسی شعر و ادب میں طنز و مزاح

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

پروفیسر اردو

ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور

TRACES OF SATIRE AND HUMOR
IN PERSIAN LITERATURE

Ashfaq Ahmad Virk, PhD
Professor of Urdu
FC College University, Lahore

Abstract

Satire and Humor is not only a literary form rather it is a style, attitude, aesthetic and delicacy which help in adding a touch of lush and sublimity to any form of literature. In prose and poetry of every language of world, they reflect multi format of their pithiness and subtlety which provide the 'dish' of literature with eternal sweetness. In this article Satire and Humor have been overviewed and analyzed and that how they show their adornment in the thousand year's old history of Persian literature. It has been evaluated critically that how the great Persian poets and writers have used Satire and Humor as a tool in nazm, ghazal, qaseeda, masnavi, hajv, shehar aashob, hikmat and stories to reform and entertain the human beings and how it added hypnotic touch to their writings.

Keywords:

فارسی، شعر، ادب، طنز، مزاح، حکیم سنائی، نظامی گنجوی، برصغیر، تہران، لاہور

جب ہم دنیا کی دیگر معروف زبانوں میں طنز ومزاح کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد فارسی ادب پر نظر کرتے ہیں تو یہاں ہمیں طنز ومزاح کا وہ معیار نظر آتا ہے نہ انداز۔ انگریزی زبان وادب میں جو طنز وظرافت ہمیں Satire اور Humour کے مروجہ معیارات کے مطابق نظر آتی ہے، فارسی میں وہ بہت دور دور تک ہزل، ہجو، شوخ چشمی، جگت بازی اور لطیفہ گوئی سے آگے بڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اکثر مقامات پر تو یہ شوخ طبعی اور جگت بازی بھی رکاکت وابتذال میں لتھڑی ہوئی ملتی ہے۔

آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ جہاں حکیم سنائی (م:۵۳۵ھ)، نظامی گنجوی (م:۵۹۸ھ)، کمال الدین اسماعیل اصفہانی (م:۶۲۶ھ)، جلال الدین رومی (م:۶۷۲ھ) اور شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (م:۶۹۱ھ) جیسے ثقہ بزرگ اور مبلغینِ اخلاق بھی بظاہر متبذل استعاروں سے اپنا دامن نہ بچا سکے ہوں، وہاں دوسرے شعرا وادبا نے اس میدان میں کون سا دقیقہ فروگذاشت رکھا ہوگا؟

ایران میں ایک طویل عرصے تک بادشاہت اور آمریت کا دور دورہ رہا ہے۔ ایسے حالات میں چوں کہ ادیب کو سماجی وسیاسی ناہمواریوں کا مضحکہ اڑانے یا ان پہ چوٹ کرنے کی آزادی میسر نہیں ہوتی، اس لیے طنز ومزاح کا تدریجی وارتقائی منازل مناسب انداز میں طے نہ کرنا بعید از قیاس نہیں ہے۔ چوں کہ بادشاہت میں ہر چیز کا مرکز ومحور شاہی دربار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فارسی کے ابتدائی طنز ومزاح میں بھی درباری رنگ غالب ہے۔ اس ابتدائی دور میں ہمیں طنز ومزاح کے تین طرح کے انداز ملتے ہیں۔

مسخرے یا دلقک

یہ لوگ باقاعدہ طور پر شاہی دربار میں ملازم ہوتے تھے۔ ان کا کام اپنی عجیب وغریب حرکات اور جگتوں سے بادشاہ کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ شاہی درباروں میں طویل عرصے تک چلتا رہا۔ لکھنؤ میں انشاءاللہ خان انشا بھی شاہی دربار میں لطیفہ گوئی پر مامور تھے بلکہ بعد کی حکومتوں میں بھی اسی طرح کا کام انجام دینے کے لیے کئی طرح کے کردار نظر آجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انھی مسخروں اور جگت بازوں کی وجہ سے ایرانی اور ہندی تہذیبوں میں ہنسنا ہنسانا محض دوسرے درجے کا کام سمجھا جاتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خطے میں بہت دیر تک اور دور تک مذکورہ شعبے میں کوئی نمایاں کارکردگی دکھائی نہیں دیتی۔

مجنون اور دیوانے

اس سے مراد وہ لوگ نہیں جو اپنے پاگل پن کی حرکات سے دوسروں کو ہنساتے ہیں بلکہ قدیم ایرانی تہذیب میں ہمیں بہت سے ایسے لوگ نظر آتے ہیں جو کڑوے سچ اور تلخ حقائق بیان کرنے کے لیے اپنے اوپر ایک طرح کا فلسفیانہ جنون اختیاری طور پر طاری کر لیتے تھے۔ ہارون الرشید کے دور میں ایسے ہی ایک کردار بہلول کا بہت ذکر ملتا ہے۔ ان لوگوں کے اقوال سے ابن عربی کے بقول آپ حکمت ٹپکتا ہے اور

ابن ابی شبلی بغدادی کے مطابق یہ زندگی کا نمک ہیں ۔انھیں ''عقلائے مجانین'' کہا جاتا ہے اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں ۔صوفیا کے تذکروں میں بھی ان کے اذکار قلمبند کیے گئے جب کہ محی الدین ابن عربی نے ''فتوحات مکیہ'' میں ان کے لیے ایک پورا باب مختص کیا ہے۔

ہجو گویان وطنز پردازان

یہ نثر نگاروں اور شاعروں کا وہ گروہ ہے جو براہِ راست ہمارا موضوع ہے۔قبل از اسلام ایرانی ادب میں طنز ومزاح کے آثار ڈھونڈنا کارِ دشوار ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں ایران میں عربوں کی آمد سے وہاں کی شاعری میں طنز کا رواج ہوا۔عربوں کو دیکھ کے ایرانی شعرا کو احساس ہوا کہ شاعری سے تو روزی بھی کمائی جا سکتی ہے،لڑائی بھی لڑی جا سکتی ہے،اور کسی کا مضحکہ بھی اڑایا جا سکتا ہے۔چنانچہ عربوں کی آمد کے بعد ایرانی ادب میں یہ تینوں رنگ اور رویے در آئے ۔اس زمانے کے شعرا ہمیں عجیب وغریب تشبیہات، لفظی الٹ پھیر،علامت نگاری،حماقت،غلو آمیزی اور طعن و دشنام سے مملو شاعری کرتے نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایران میں ہمیں مزاح کی جو ابتدائی صورتیں نظر آتی ہیں ، وہ شعرا و ادبا کی آپس کی دوستانہ محافل کی نکتہ سنجیوں، شاعرانہ چشمک،شوخیوں، لطائف اور ہلکی پھلکی نوک جھونک پر مشتمل ہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان رویوں میں اخلاقیات، نصیحت،تنقید اور ذہانت کے پہلو بھی شامل ہوتے چلے گئے ۔یہاں تک کہ آج کا ایرانی دانشور اور محقق،طنز نگاری کو ادبی تنقید میں سب سے بلند درجہ دیتا ہے کہ جو محض ادب ہی نہیں بلکہ بعض اوقات پورے معاشرے کی تطہیر کا سبب بن جاتی ہے۔ذیل میں ایرانی ادب میں طنز وظرافت کی مختلف صورتوں کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ پیش ہے۔

رودکی (م:۹۴۱ء)

رودکی کو فارسی کا ابتدائی شاعر ہونے کی بنا پر فارسی شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے ۔اگر چہ اس کا بیشتر کلام ضائع ہو چکا ہے، تاہم جو اشعار ملتے ہیں، ان میں طنز ومزاح کے ابتدائی نقوش بھی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں ۔رودکی کی طنز اس آلودگی سے محفوظ ہے جو بعد میں آنے والے شعرا کا خاصہ رہی ہے۔ رودکی سامانی دور کا شاعر ہے۔ وہ ۳۲۹ھ/۹۴۱ء میں فوت ہوا۔اسی دور میں صنعی اور دقیقی وغیرہ کے ہاں بھی بعض طنزیہ اشعار نظر آتے ہیں، جن میں کہیں کہیں شگفتگی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے ۔اسی زمانے میں منجیک ترمذی نامی ہجو نگار دکھائی پڑتا ہے،جس کا قلم طنز وہجو میں اس قدر رواں ہے کہ کوئی بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں ۔وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے:

از آدم اندرون ز تبار کسی نماند   کو را ہجا نکرد ست منجیک، نام نام

(آدم سے لے کر اس دور تک شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس کی منجیک نے نام لے لے کر ہجو نہ کہی ہو)

غزنوی دور

محمود غزنوی نے ۳۸۹ھ/۹۹۹ء میں سامانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔غزنوی دور کی سب سے اہم تصنیف ابوالقاسم فردوسی (۳۲۹ھ۔۴۱۵ھ) کا شاہنامہ ہے جو تقریباً ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہے اور تقریباً بتیس سال میں مکمل ہوا۔شاہنامہ کے مختلف کرداروں کی زبان سے متعدد ایسے اشعار ادا ہوئے ہیں جو لطیف طنز اور ہجو کا بڑا خوبصورت نمونہ ہیں، اور پھر مقررہ انعام کے سلسلے میں محمود سے دلبرداشتہ ہو کر لکھی جانے والی ہجو کے اثرات تو ایسے دوررس ہیں جو بقول شبلی نعمانی قیامت تک نہیں مٹ سکتے۔ (۱)

تقریباً اسی زمانے میں فرخی (م:۴۲۹ھ) عنصری (م:۴۳۱ھ) اور رازی وغیرہ کے ہاں بھی طنز وظرافت کی مثالیں ملتی ہیں۔علاوہ ازیں منوچہری کے تمثیلی انداز میں بھی لطافت وشگفتگی کی جھلکیاں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

سلجوقی دور

غزنویوں کے بعد ایران میں سلجوقی خاندان کا دور آتا ہے جس کا آغاز ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء میں ہوتا ہے۔سلجوقی دور آقاؤں اور غلاموں کے عجیب وغریب تعلقات اور کشمکش کا دور تھا۔ان کی ہر حکومت میں غلاموں کی ایک فوج ظفر موج ہر کام میں دخیل تھی۔لہٰذا اس دور کے شعرا کے ہاں بھی جو طنز ومزاح ملتا ہے، اس میں اپنے اردگرد کے ماحول کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔مثال کے طور پر اسعد گرگانی (م:۱۰۷۳ء) کی مثنوی ''ویس ورامین'' اور حکیم ارزقی (م:۱۰۸۰ء) کے کلام میں طنز ومزاح کے جو نمونے ملتے ہیں، ان کا انداز مدحتیہ ہے۔اسی طرح ناصر خسرو بھی اپنے دیوان میں پند ونصیحت کی تلقین کے ساتھ ساتھ ناپسندیدہ شخصیات اور رویوں پر بڑے سخت انداز میں حملہ آور ہوتا ہے۔مثلاً ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ہر کہ چون خر فتنۂ خواب و خورست
گرچہ آدم صورتست او ہم خراست

(جو کوئی بھی گدھے کی طرح کھانے پینے اور سونے کا شیدائی ہے۔وہ اگرچہ بظاہر آدمی ہے لیکن ہے گدھا ہی)

مسعود سعد سلیمان لاہوری (پ:۴۳۹ھ۔م:۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء)

یہ بھی اسی دور کا ایک شاعر ہے۔اس نے طویل عرصے تک قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔پھر والی برصغیر پاک وہند سیف الدولہ محمود بن ابراہیم کے ساتھ لاہور چلا آیا اور حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا۔اسے اُردو غزل کے بانیوں میں بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔مسعود طبعاً ایک زندہ دل اور مزاح پسند آدمی تھا۔لہٰذا اس کی تحریروں میں بھی طنز ومزاح اپنی مختلف صورتوں میں موجود ہے۔یہ مزاح تلخ ہونے

کے بجائے لطافت اور نرمی لیے ہوئے ہے۔ وہ ''درصفتِ یارِ رنگ'' میں محبوب کے بات نہ کرسکنے کا بڑا خوبصورت جواز بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ ''بات اصل میں اس شیریں لبوں پر عاشق ہوگئی ہے اور اب ان لبوں سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔'' (۲)

مسعود کو اپنے علم و فضل کی بنا پر حاسدوں سے لگائی بجھائی کی صورت میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس لیے وہ بعض جگہوں پر علم و ہنر کی بھی مذمت کرتا اور معمولی پیشوں کو اس سے برتر قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ انداز بھی علم دشمنوں پر بھرپور طنز کا درجہ رکھتا ہے۔

عثمان مختاری (پ: ۴۵۸ھ/ ۱۰۶۶ء۔ ۵۴۵ھ/ ۱۱۵۰ء)

حکیم ابوعمر عثمان مختاری گیارھویں / بارھویں صدی عیسوی کا معروف شاعر ہے۔ سنائی نے اسے ''امیر سخنان'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اس کا دیوان آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جس میں مدحیہ قصاید کے ساتھ ساتھ ہجو و مزاح کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ خاص طور پر وہ ہجو جو ایک قرض خواہ کی مذمت میں ہے، بہت مزے کی ہے اس کے علاوہ بھی اس کے کلام میں بذلہ گوئی و شوخ طبعی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

عمر خیام (پ: ۴۰۸ھ۔ ۵۰۹ھ/ ۱۱۱۵ء)

اسی زمانے کے شاعر حکیم ابوالفتح عمر خیام نے بھی اپنی رباعیات کی بنا پر عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ خیام اپنے دور کا ایک عظیم دانشور تھا جسے طب، حکمت، علم نجوم اور دیگر بے شمار علوم و فنون میں بے پناہ دسترس حاصل تھی۔ وہ مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار تھا اور علما کی ریاکاری، منافقت اور مکر و فریب کی خوب خبر لیتا تھا۔ اس کی یہ رباعی ملاحظہ ہو:

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی
کز خیر گستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم
تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی؟

(ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو ہر گھڑی بدمست ہے اور یہ خیال نہیں کرتی کہ کس چیز کو چھوڑنا ہے اور کسے اختیار کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں جیسی ہوں ویسی نظر بھی آتی ہوں لیکن تم؟ (۳)

خیام زاہد خشک اور واعظ ریاکار کے ساتھ ساتھ بعض جگہوں پر مذہب کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور کہیں کہیں تو خود کو بھی نہیں بخشتے۔ ذرا ان کی یہ رباعی ملاحظہ ہو:

نہ لائقِ مسجدم نہ در خور کنشت
ایزد داند گِل مرا از چہ سرشت

نہ دین و نہ دنیا و نہ امید بہشت
چو کافرِ درویشم و چوں قحبۂ زشت

(میں مسجد اور کنشت کسی کے بھی لائق نہیں ہوں۔ اللہ جانے اس نے میرا خمیر کس چیز سے اٹھایا ہے کہ میرے لیے نہ دین ہے، نہ دنیا اور نہ ہی بہشت کی کوئی امید۔ میری حالت تو ایک کافر فقیر اور بد صورت رنڈی کی سی ہے)

حکیم سنائی (م:۵۳۵ھ)

حکیم سنائی بھی فارسی زبان کے بڑے معروف اور برگزیدہ شاعر گزرے ہیں۔ آخری عمر میں حقایق و معارف کی شاعری کی لیکن ابتدا میں ان کے ہاں بھی طنز و ہزل کے کئی نمونے ملتے ہیں۔ ان کی اپنے دور میں سوزنی، شہابی، معجزی اور حکیم صابونی وغیرہ سے نوک جھونک چلتی رہی۔ پھر اسی دور میں عمعق نجارائی، سید حسن غزنوی (م:۱۱۶۱ء)، رشید الدین وطواط (م:۵۷۲ھ)، ادیب صابر (م:۱۱۴۵ء)، بوعلی سینا، اثیر الدین (م:۱۲۱۱ء)، ابوالعلا گنجوی، عبدلواسع جبلی، حکیم جلال اور مہستی گنجوی وغیرہ کے ہاں بھی طنز و مزاح کے کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر ابوالعلا گنجوی کی اپنے شاگرد اور داماد خاقانی اور رشید وطواط کی اس دور کے تقریباً ہر شاعر سے چھیڑ چھاڑ چلتی رہی ہے۔

سوزنی (م:۱۱۷۰ء)

سوزنی فارسی زبان کا وہ شاعر ہے جسے ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی نے ''شاعرِ زبان دراز'' کے لقب سے یاد کیا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہدف پر حملہ آور ہوتے ہوئے تمام اخلاقی حدود پھلانگ جاتا ہے۔ بھلا جو شاعر خود اپنے بارے میں حرام زادہ، فساد پیشہ اور جانور وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتا ہو، اس سے کسی دوسرے کی بھلائی کی امید کیوں کر رکھی جا سکتی ہے؟ خاص طور پر حکیم جلال اور سنائی تو اس کی ہجو گوئی کا خوب خوب نشانہ بنے ہیں۔ سوزنی کے ہاں لفظ قلم سے نہیں بلکہ کمان اور بندوق سے نکلتے ہیں۔ پھر اسے اپنی ہجو گوئی پر اس قدر ناز ہے کہ وہ دوسروں کو نہ صرف دھمکیاں دیتا ہے بلکہ انھیں سرِعام مقابلے کے لیے بھی للکارتا ہے۔ وہی ہمارے فلمی ولن والا انداز ہے۔ مثلاً وہ سنائی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اے سنائی تو کجائی کہ بخونِ تو دریم

بعض مواقع پہ تو اس نے زندہ شعرا کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔ اصل میں یہ بھی اس کی ہجو کا نیا انداز ہے۔ اس کی ہجویات میں متعدد مقامات پر مزاح کے بڑے عجیب و غریب رنگ سامنے آتے ہیں۔ وہ صورت حال کے ساتھ ساتھ لفظی تکرار اور لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی مزاح پیدا کرتا ہے۔

انوری (م:۵۸۶ھ)

انوری کی ہجو نگاری کا اندازہ علامہ شبلی نعمانی کی اس رائے سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ:

''انوری کا اصل مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا۔'' (۴)

انوری چھٹی صدی ہجری کا اہم ترین قصیدہ و ہجو نگار ہے۔ یہ نثر اور شاعری کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون مثلاً حکمت، فلسفہ، طبعیات، الٰہیات، خطاطی اور شطرنج وغیرہ میں بھی ماہر تھا۔ سوزنی کے برعکس اس کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے۔ اس کی اپنی ہجو نگاری کا مقصد بھی وہی ہے جو وہ عام شعرا کے لیے بیان کرتا ہے کہ پہلا شعر مدح کا، دوسرا تقاضا کرنے کا اور تیسرا دھمکی آمیز۔ (۵)

انوری فارسی زبان کا پہلا شاعر ہے جس کے ہاں عورتوں کی بھی بے شمار ہجویں نظر آتی ہیں۔ عورتوں کے بارے میں اس کا لہجہ بڑا تلخ ہے مثلاً اس کا یہ شعر:

تو زنِ غُر بہ طبع می خواہی؟ یا چنیں اتفاق می افتد

(آیا تو طبعاً بے غیرت ہے یا یہ سب کچھ اتفاقی امر ہے)

انوری اپنی ہجوؤں میں ایک ایسے سانپ کی مانند نظر آتا ہے کہ جس نے اُسے دودھ نہیں ڈالا اس نے اسے ڈس لیا۔ وہ امرا کی کنجوسی یا انعام نہ دینے پر بھڑک اٹھتا ہے۔ ایک قطعے میں دیکھیے امیر کی کس طرح مٹی پلید کرتا ہے:

بخل را دیدم وسخا ہر دو کردہ اندر سرای خواجہ وطن

ہر یکی با یکی گرفتہ قرار بخل با خواجہ وسخا با زن

(میں نے امیر کے محل میں کنجوسی اور سخاوت دونوں ملاحظہ کی ہیں۔ اول الذکر کا تعلق امیر سے ہے جب کہ موخر الذکر کا اس کی بیگم سے۔ (عورت کے حوالے سے سخی کا لفظ کتنا پر معنی ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔)

انوری کے ہاں خالص مزاح کے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لمبے قد والے شخص پر دیکھیے کس انداز سے قلم طراز ہوتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب تخیل انوری ہی کو سوجھ سکتا تھا:

اے خواجہ رسید بلندیت بہ جای

کز اہل سموات بہ گوشت بر سد صوت

گر عمر تو چون تو باشد بدر از می

تو زندہ بہ مانی وبمیرد ملک الموت

(اے شخص تیرا قد اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ تو اہل فلک کی گفتگو سن سکتا ہے اور اگر تیری عمر بھی تیرے قد کی طرح لمبی ہو گئی تو مجھے لگتا ہے تو زندہ رہے گا لیکن تب تک ملک الموت مر چکا ہو گا) (۶)

یا پھر بادشاہ اور بدو کے درمیان مکالمے والا قطعہ دیکھا جا سکتا ہے، جس میں انوری نے ظرافت کا کیا خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے: ایک بدو بادشاہ کے پاس آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں حج کرنا چاہتا ہوں، مجھے کچھ عنایت کر، میں وہاں تیرے حق میں دعا کروں گا۔ وہ اسے اس کی مطلوبہ رقم کے علاوہ کچھ مزید رقم دے کر کہتا ہے کہ یہ میری طرف سے خاموشی اختیار کرنے کی رشوت ہے۔ خدا کے لیے وہاں میرے لیے دعا نہ کرنا کیوں کہ مجھے علم ہے کہ ایک نا اہل وکیل موکل کا مقدمہ خراب کر دیتا ہے۔

جمال الدین اصفہانی (م: ۵۸۸ھ)

یہ بھی انوری کے زمانے کے شاعر ہیں۔ شروع میں ہجو نگاری میں خوب قلم چلتا رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا قلم سانپ کی طرح زہر اگلتا ہے۔ اس کے باوجود اگر میں کسی کی ہجو نہیں لکھتا تو یہ لوگوں پر میرا احسان ہے۔ ان تمام دعووں کے باوجود وہ آخری عمر میں ہجو سے تائب ہو گئے۔ انھوں نے بھی اپنی شاعری میں بخیل امرا کی خوب خبر لی ہے۔ ایک بخیل بادشاہ سے مانگنے کا طریقہ دیکھیے کیسا دلچسپ ہے:

ورنہ رخصت دہد کہ اندر شرع
روزۂ عید داشتن شاید

(یعنی تو اگر مجھے کچھ دے نہیں سکتا تو مجھے کم از کم ایک فتویٰ عنایت فرما دے کہ عید کے دن بھی روزہ رکھنا جائز ہے۔) (۷)

ظہیر فاریابی (م: ۵۹۸ھ)

یہ بھی جمال و خاقانی و نظامی کا ہم عصر تھا۔ مزاج ایسا تھا کہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ انوری نے، جو اپنے زمانے کا ایک نجومی بھی تھا، کسی موقع پر تیز آندھی چلنے کی پیش گوئی کی، جب کہ اس وقت کچھ بھی نہ ہوا۔ معمولی سی ہوا بھی نہ چلی تو ظہیر نے یہ قطعہ کہا جو طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ ہے:

می گفت انوری کہ شود بادہا چنانک
کوہِ گران ز پای در آید، چہ بنگری
سالی گزشت و برگ نجنبید از درخت
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(انوری نے دعویٰ کیا کہ ایک ایسی تیز آندھی چلنے والی ہے کہ جو پہاڑوں کو بھی جڑ سے اکھیڑ دے گی۔ ہم نے دیکھا کہ وہ وقت گزر گیا اور پتا تک نہ ہلا۔ اب اس کا بھیجا ہوا کا مالک بتا سکتا ہے یا انوری۔) (۸)

خاقانی (پ: ۵۱۵ھ۔م: ۵۹۵ھ)

یہ ابو العلا گنجوی کا شاگرد اور داماد تھا۔ اصل نام افضل الدین جب کہ تخلص حقایقی تھا مگر خاقان اکبر منوچہر کے دربار سے وابستہ ہونے پر خاقانی کہلایا جانے لگا۔ قصیدہ نگاروں میں اتنا معتبر مقام رکھتا ہے کہ اسے ''حسان العجم'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

خاقانی انتہائی زود رنج تھا اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا، پھر سامنے باپ ہو یا استاد، سب پر چڑھ دوڑتا تھا۔ کہیں وہ اپنے استاد کے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے اور شیطان نے ایک ہی چھاتی سے دودھ پیا ہے اور کبھی اپنے باپ کو آتش نمرود کا ہمزاد کہتا ہے۔ رشیدالدین وطواط اس کے اچھے دوستوں میں سے تھا لیکن جب اس سے بگڑی تو اسے یہاں تک کہہ دیا:

این گربہ چشمک این سگک غوری غرک
سکسارک مخنث و زشت کافرک

(یہ بلی کی آنکھ والا غوری پلا، باؤلے کتے کی طرح بدفطرت ہیجڑا، خبیث، بے ایمان ہے)

بہر حال خاقانی کے ہاں خالص مزاح کی مثالیں کم اور طنز و تضحیک کے نمونے بے شمار ہیں۔

نظامی گنجوی (م: ۵۹۹ھ)

نظامی مثنوی نگاروں میں بڑا بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی پانچ مثنویوں کو "پنج گنج" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جن کی تقلید میں ہر زمانے کے اہم شعرا نے اہم مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کے ہاں بھی "سکندر نامہ" اور "خسرو وشیریں" وغیرہ میں بعض مقامات پر ہلکے پھلکے طنز کے انداز نظر آتے ہیں۔ "سکندر نامہ" میں بعض مزاحیہ حکایات کو بھی بڑی خوبصورتی سے نظم کیا گیا ہے۔

کمال الدین اسماعیل اصفہانی (م: ۶۲۶ھ)

یہ جمال الدین اصفہانی کے فرزندِ ارجمند اور ایران کے معروف شاعر تھے۔ ان کے خیال میں شاعر و ادیب کے لیے طنز و ہجو اتنی ہی ضروری ہیں، جتنے شیر کے لیے پنجے اور دانت۔ اپنی شاعری میں اسی نظریے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انھوں نے طنز و ہجو و مزاح کا خوب استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر بخیل نوابین کو انھوں نے خوب لتاڑا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے تہذیب اور لطافت کا دامن نہیں چھوڑا۔ علامہ شبلی نعمانی کے بقول:

> "شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اس کو نہایت لطیف اور پر مزا کر دیا۔"(۹)

مثال کے طور پر ان کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

خواجہ در ماہتاب نان می خورد
در سرای کہ ہیچ خلق نبود
سایۂ خویش را کسے پنداشت
کاسہ از پیش خویشتن بہ بود

(یعنی امیر اگر چاندنی میں بیٹھ کر کھانا کھا رہا ہو جہاں دور دور تک کوئی موجود نہ ہو تو وہاں اپنے ہی سائے سے ڈر کر برتن چھپانے لگتا ہے۔)

یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ بے شمار ایرانی شعرا کو تمام رئیس اور نواب کنجوس نظر آتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کی مرضی کا انعام و اکرام نہیں دے پاتے۔ اس لیے یہ فوری طور پر ہجو و تضحیک پر اتر آتے ہیں۔ گویا یہ طنز و مزاح سے زیادہ دل کے پھپھولے اور ذاتی رنجشیں ہیں جن میں کہیں انداز تلخ ہو کر طنز کے قریب ہو گیا ہے اور کہیں بات مضحک ہو کر جیسے تیسے مزاح کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

رومی (م:۶۷۲ھ) و سعدی: (م:۶۹۱ھ)

عرصے تک ایران میں طنز و مزاح کا دائرہ ذاتی عناد اور باہمی پرخاش سے آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں رومی و سعدی کی شکل میں فارسی زبان کو دو ایسے ادیب و شاعر میسر آئے، جنھوں نے طنز و مزاح کے آفاق پھیلا دیے اور ذاتی ظرافت کے ڈانڈے آفاقی ظرافت سے ملا دیے۔ انھوں نے طنز و مزاح کو محض طعن و تعریض اور تفریح کی بجائے اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں:

ہزل تعلیم است ، آن را جد شنو
تو مشو بر ظاہر ہزلش گرو

(یعنی ہزل ایک تعلیم ہے جس کو غور اور سنجیدگی سے سنو۔ تو اس کے ظاہری مطلب کو لے کر نہ بیٹھ جا۔)

مولانا رومی کی مثنوی کو ''پہلوی زبان کا قرآن'' کہا جاتا ہے۔ یہ مثنوی چھبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کا تمثیلی انداز بہت خوب ہے، جس میں بعض انسانی رویوں پر طنز بھی ہے اور بعض حکایتوں اور تمثیلوں میں دلچسپی کے بے شمار عناصر بھی موجود ہیں۔ یہ حکایتیں جہاں اخلاقی اسباق کے طور پر بہت اونچے درجے پر فائز ہیں وہاں لطافت و مزاح کے اعتبار سے بھی نہایت بلند پایہ ہیں۔ مولانا روم ظاہر بیں علما کو شکاری سے تشبیہ دیتے ہیں، جو تصوف کی چند اصطلاحات یاد کر کے اسی طرح لوگوں کو پھانستے ہیں، جس طرح ایک شکاری جانوروں کی بولیاں یاد کر کے ان کو دھوکا دے کر شکار کرتا ہے۔

شیخ سعدی شیرازی بھی اگرچہ بطور ایک مبلغِ اخلاق کے جانے جاتے ہیں لیکن گلستان و بوستان میں انھوں نے پند و نصیحت کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ انتہائی لطیف، دلچسپ اور پُر مزاح بھی ہے؛ ان کی تشبیہات، تمثیلیں اور مثالیں نہایت مزے دار ہوتی ہیں اور ان کی نظم و نثر لطائف، چٹکلوں اور دلچسپ حکایتوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ دونوں حضرات بھی علمائے سُو اور رُہادِریائی پر بڑے بلیغ انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان دونوں نے طنز و مزاح کو ذاتی اغرض و مخاصمت کے بجائے اخلاقیات کے نہایت

اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے اور اس کو محض دل لگی یا وقت گزاری کا وسیلہ ہی نہیں جانا بلکہ ہمیشہ اس کے مثبت اثرات پر بھی نظر رکھی ہے۔(۱۰)

امیر خسرو (م: ۷۲۵ھ)

امیر خسرو کی تربیت ایسی تھی کہ بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔بعد میں بے شمار علم وفنون (موسیقی اور راگنیاں سمیت) میں دسترس حاصل کی۔علاؤالدین خلجی کے دور میں ایران سے ہندوستان آئے اور حضرت نظام الدین اولیا کے حلقہ ارادت میں رہے۔ یہاں ہندوی (پرانی اردو) اور سنسکرت میں بھی مہارت حاصل کی۔ان کے بعض اشعار تو ہندی اور اردو میں ضرب الامثال کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودی اگر بودی زبانش در دہانِ من

خسرو کے متعدد اشعار میں خیال کی ندرت نے شوخی اور لطافت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔چند مثالیں:

نہ رود مہ بہ اوج در شبِ تار
تا ز زلفِ تو نردبان نہ برد
راہی است برای بُردنِ دل
ابروئے تو کز میان کشاد است

(چاند اندھیری رات میں اس وقت تک بلند نہیں ہوسکتا، جب تک تیری زلفوں کی سیڑھی نہ لگائے۔تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان راستہ اس لیے ہے کہ وہاں سے دل لے جایا جاسکے۔)(۱۱)

پھر امیر خسرو کے اردو کلام کی بھی کافی مثالیں ملتی ہیں، جن میں طنز ومزاح کے حوالے سے وہ شعر درج کیا جاسکتا ہے، جس میں چند لڑکیوں کے فرمائش کرنے کا ذکر ہے، کہ کسی نے کہا ایسا شعر سنائیں، جس میں چرخے کا ذکر آئے، کسی نے ڈھول کہا اور کسی نے کتا وغیرہ۔امیر خسرو نے یہ شعر پڑھا اور سب کی فرمائش پوری کر دی:

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اسی دور میں ہمیں اوحدی اصفہانی، خواجو کرمانی، ابن یمین، سلمان ساوجی (م:۷۷۸ھ / ۱۳۷۶ء)، ناصر بخاری اور اطعمہ والبسہ وغیرہ کے ہاں بھی طنز ومزاح کے نمونے مل جاتے ہیں لیکن ان سب کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے۔

عبید زاکانی (م:۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء)

خواجہ نظام الدین عبید زاکانی آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کا معروف ترین ایرانی شاعر ہے جو سنجیدہ شاعر کی مناسب قدر نہ ہونے کی بنا پر ہجو و ہزل کی طرف مائل ہوگیا۔ اس کا اپنا ایک شعر ہے:

رَو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا دادِ خود از مہتر و کہتر بستانی

(تو مسخرہ پن کو پیشہ بنا اور گانا بجانا سیکھ لے تا کہ خواص و عوام سے داد پا سکے۔)

عبید زاکانی بڑی جرأتِ رندانہ کا مالک تھا۔ حق گوئی و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے اپنے فرماں رواؤں کی چیرہ دستیوں اور عوام کی لاچارگی کو اپنی طویل نظم ''موش وگربہ'' میں بڑے خوبصورت علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔ عبید اپنے معاشرے کا بہت بڑا نباض تھا۔ اس کی دکھتی رگوں پر ڈھنگ سے انگلی رکھنا جانتا تھا اور ہنسی ہنسی میں ان کا علاج بھی تجویز کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنے دور کے علما، قاضیوں، وکیلوں اور حکمرانوں پر بھی چوٹیں کرتا اور رنگا رنگ حکایتوں، کہانیوں اور واقعات سے عوام کو بھی خوش کرتا ہے۔ بلکہ خوشی کے معاملے میں تو وہ اس قدر فراخ ہے کہ اس سلسلے میں جھوٹ کو بھی روا رکھتا ہے۔ اس کا شعر ہے:

دروغی کہ حالِ دلت خوش کند
بہ از راستی کت مشوش کند

(ایسا جھوٹ کہ جو تیرا دل خوش کردے، تشویش میں ڈال دینے والے سچ سے بہتر ہے۔)

عبید کے ہاں نظم و نثر میں خالص مزاح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ تحریف نگاری میں بھی اس کا قلم خوب رواں ہے۔ بخیل لوگوں کے بارے میں عبید کی چھے حکایات ''آئمہ بخل'' کے نام سے ملتی ہیں جن میں ایک حکایت کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ یہ حکایت ان کی معروف تصنیف ''رسالہ اخلاق الاشراف'' میں ہے:

''ایک امیر نے اپنے خادم سے کہا کہ تم اپنی جیب سے میرے لیے گوشت لا کر پکاؤ، جسے کھا کر میں تمھیں آزاد کردوں گا۔ نوکر نے خوشی خوشی گوشت لا کر بریانی پکائی۔ مالک نے بریانی مزے لے لے کر کھائی اور گوشت چھوڑ دیا اور نوکر کو حکم دیا کہ اب اسی گوشت میں چنے ڈال کر پکاؤ تا کہ میں اسے کھا کر تجھے آزاد کردوں۔ غرضیکہ جب دو تین چار بار گوشت کے ساتھ یہی سلوک کر چکا تو نوکر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا کہ حضور آپ مجھے اس صلے کے عوض آزاد فرمائیں یا نہ فرمائیں لیکن خدا کے لیے اس گوشت کو ضرور آزاد فرما دیں۔''(۱۲)

یا پھر دیوانِ عبید زاکانی میں ایک قطعہ ملتا ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''شیخ شرف الدین ورگزینی اور مولانا عضدالدین ایجی ایک بزرگ کے گھر میں رہتے تھے۔ جب دسترخوان لگایا گیا تو عوام اور مریدین میں جوش وخروش تھا کہ شیخ کا تبرک کھائیں۔ایک شخص جو مولانا کو نہیں پہچانتا تھا، کہنے لگا کہ مجھے شیخ کا نیم خوردہ (جھوٹا کھانا) عنایت فرمایئے۔شیخ نے برجستہ کہا کہ نیم خوردہ کسی دوسرے سے طلب کیجیے، میں تو شیخ کا تمام خوردہ رکھتا ہوں۔''

حافظ شیرازی (م:۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء)

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، جنھیں ''لسان الغیب'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے، انھیں فارسی غزل کا امام مانا جاتا ہے۔ان کے ہاں بھی طنز وظرافت اور چھیڑ چھاڑ کی متعدد مثالیں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔مشہور ہے کہ جب حافظ کے اس شعر کا چرچا ہوا:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را

(اگر میرا ترک محبوب میرے پاس آجائے تو میں اس کے چہرے کے کالے تل کے بدلے سمرقند و بخارا جیسے دو شہر دینے کو تیار ہوں۔)

تو اسی زمانے میں امیر تیمور نے انھیں اپنے دربار میں طلب کرلیا۔مذاق مذاق میں اس بات کا بھی ذکر آیا کہ وہ شہر جو ہم نے بے پناہ کشت وخون کے بعد حاصل کیے ہیں، آپ انھیں محض ایک کالے تل کے بدلے دینے پر تیار ہوگئے ہیں۔بات آئی گئی ہوگئی۔باہر آکر لوگوں نے پوچھا کہ بادشاہ نے تو آپ کی خوب کھنچائی کی ہوگی۔کیا آپ اب بھی اپنے موقف پر قائم ہیں؟ تو حافظ نے کہا کہ اب تو میرا موقف اور بھی مضبوط ہوگیا ہے اور برملا یہ شعر پڑھا:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
برای یک نظر دلبر بہ بخشم ہر دو عالم را

(اگر میرا ترک محبوب میرے پاس آجائے تو اس کی ایک نظر کے بدلے میں دونوں جہاں دینے کو تیار ہوں)

حافظ کی طنز کا سب سے بڑا نشانہ واعظ، ناصح، زاہد، صوفی اور مفتی وغیرہ ہیں۔وہ علمائے سوء کے مکروفریب پر نہایت شوخی اور ظرافت کے ساتھ تبصرہ فرماتے ہیں:

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
قولِ مانیز ہمیں است کہ او آدم نیست

(واعظ شہر کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، ہمارا بھی یہی قول ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے۔)

بلکہ بعض اوقات تو حافظ اس طبقے کے خلاف اس قدر طیش میں آجاتا ہے کہ یہاں تک فتویٰ دے دیتے ہیں:

گر محتسب بر کدوِ بادہ زند سنگ
شکن تو کدوی سرِ او نیز بخشتی

(اگر محتسب تیرے شراب کے پیالے پتھر پر مارے تو تُو بھی ایک اینٹ کے ساتھ اس کے سر کا کاسہ توڑ دے۔)

حافظ کو اپنے دور میں یہ احساس تھا کہ ظلم کے عقاب نے چاروں طرف پر پھیلا رکھے ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے کسی گوشتہ نشین کے تیر کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں ظالم عقابوں کی طرف طنز کے جتنے بھی تیر نظر آتے ہیں، ان میں اغلب حصہ حافظ کا ہے۔ پھر حافظ نے فارسی غزل کے روایتی محبوب سے متعلق بھی ایسی ایسی مضمون آفرینی کی ہے کہ اکثر مقامات پر بڑی دلچسپ اور شگفتہ صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کا شعر:

آفرین بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتہ غمزۂ خود را بہ جناز آمدہ ای

(تیرے دل کی نرمی کے قربان جاؤں کہ جو ثواب کی خاطر اپنے ہی ناز و انداز سے قتل ہونے والے کی نمازِ جنازہ میں جا شریک ہوا ہے۔)

فارسی نثر کی کہانی

ایرانی ادب میں طنز و مزاح کے آثار ہمیں ایران میں عربوں کی آمد کے ساتھ ہی نظر آنے لگتے ہیں۔ اس حساب سے فارسی طنز و مزاح کی تاریخ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہے، ایرانی ادب کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں طنز و مزاح کسی باقاعدہ تحریک یا رجحان کے بجائے بکھری ہوئی اور بے قاعدہ صورتوں میں نظر آتا ہے اور اس کا سارا مزاج طعن و ہجو سے مملو ہے اور اس کے موضوعات اور اہداف زیادہ تر ذاتی اور وقتی نوعیت کے ہیں۔ طنز و ظرافت کی یہ شکل بھی ہمیں زیادہ تر فارسی شاعری ہی میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ فارسی نثر بھی اپنی قدامت کے اعتبار سے کچھ کم نہیں ہے۔ ذیل میں فارسی کے نثری سلسلے کا بھی نہایت اختصار سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

فارسی نثر کے ابتدائی نمونوں میں ۳۵۰ھ میں منصور سامانی کے ایک وزیر کا ''تاریخ طبری'' کا کیا ہوا ترجمہ ملتا ہے۔ ۴۰۰ھ کے قریب بوعلی سینا نے ''حکمتِ فارسیہ'' لکھی۔ جس کا انداز بعض جگہوں پر پُر لطف ہے۔ اسی طرح شاہ ناصر خسرو نے اپنا سفر نامہ ''کنز الحقائق'' فارسی نثر میں ۴۵۰ھ کے لگ بھگ لکھا، جس میں اس کے بے تکلف اندازِ بیان نے کہیں کہیں شگفتگی کی فضا پیدا کر دی ہے۔

غزنوی دور میں بھی بعض نثری تصانیف ملتی ہیں، جن میں بیہقی کی ''تاریخِ بیہقی'' قابل ذکر ہے کہ اسی میں بعض دلچسپ واقعات وحکایات نے مزاح کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ پھر ۵۰۰ھ کے قریب ہی بہرام شاہ کے عہد میں حمید الدین نصر اللہ نے معروف عربی سلسلۂ حکایات ''کلیلہ و دمنہ'' کو فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۵۵۰ھ میں قاضی ابوبکر حمید نے ''مقاماتِ حمیدی'' لکھی ہے۔ جس کا اسلوب عربی سے بہت متاثر ہے اور بقول محمد حسین آزاد: ''عربی لفظوں کی یہ بہتات ہے گویا ریگستانِ عرب سے آندھی اٹھی۔''(۱۳)

۵۶۰ھ میں نظامی عروضی سمرقندی کی معروف تصنیف 'چہار مقالہ' نظر آتی ہے۔ اس کا اسلوب اور اندازِ بیان بھی لطیف ہے۔ پھر اسی صدی میں ہمیں رشید الدین وطواط کے ہاں بھی شگفتہ تحریروں کے چند نمونے نظر آجاتے ہیں۔ علاؤ الدین علا الملک جوینی نے ۶۰۰ھ کے بعد 'تاریخِ جہاں کشا' لکھی جس کا اسلوب سادہ اور بے تکلفانہ ہے۔

۶۵۶ھ میں فارسی نظم ونثر کا وہ شاہکار منظر عام پر آیا کہ جس کی مثال پورا فارسی ادب شاید آج بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ فارسی نثر کی پہلی کتاب ہے، جس کے فقرے لوگوں کی زبانوں پر شعروں کی صورت رواں ہوگئے۔ یہ معرکتہ الآرا تصنیف شیخ مصلح الدین سعدیؒ کی 'گلستان' ہے جسے ہم فارسی میں شگفتہ ولطیف نثر کی پہلی کامیاب کڑی بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس صنف کا نقطۂ عروج بھی۔ خدا جانے شیخ سعدی نے اس میں کیا کمال بھر دیا ہے کہ یہ آٹھ سو سال گزرنے کے بعد ہر دور کی طرح آج بھی اسی طرح تر وتازہ ہے اور آج بھی اس سے ہر مزاج کا قاری حظ اٹھاتا ہے۔

پھر اسی تسلسل میں چنگیز خانوں سے داد پانے والے نصیر الدین محقق طوسی نظر پڑتے ہیں، جن کی منطق وفلسفہ، اصلاحِ نفس، حکمتِ اخلاق اور عروض وغیرہ پر متعدد تصانیف انشا پردازی کے میدان میں بھی کمالات دکھاتی نظر آتی ہیں۔ ۶۹۹ھ میں عبداللہ وصاف (م: ۷۱۸ھ) کی 'تاریخ وصاف' لکھی گئی جو تاریخ سے زیادہ نثر نگاری کی سند قرار پاتی ہے۔ ایسی مسجع ومقفّٰی اور قدم قدم پر فی البدیہہ اشعار سے مرصع نثر ہمیں اردو میں مولانا ابوالکلام کے ہاں نظر آتی ہے۔

۷۳۰ھ میں فخر الدین بناکتی کی 'تاریخ بناکتی' ملتی ہے۔ ادھر ہندوستان میں ضیاء الدین برنی سراج عفیف کی 'تاریخ فیروز شاہی' منہاج السراج کی 'طبقاتِ ناصری' اور سب سے بڑھ کر امیر خسرو کی 'اعجاز خسروی' اور 'خزائن الفتوح' بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ امیر خسرو کی نثر بھی ان کی شاعری اور شخصیت کی طرح انتہائی رنگین ہے۔ اس کی عبارت میں قدم قدم پر صنائع بدائع اور جگت بازی کی بہار نظر آتی ہے۔ ان کی موخر الذکر کتاب کا موضوع اگرچہ تاریخ ہے مگر انھوں نے اپنی شگفتہ ورنگین مزاجی کی بنا پر اسے بھی لطیف نثر کا شاہکار بنادیا ہے اور بقول آزاد:

''بعض بعض فقرے ایسے ٹپک گئے ہیں کہ ہزار خون جگران پر قربان ہیں۔''(۱۴)

۷۷۱ھ کے قریب امیر تیمور کا دور آتا ہے۔اس کے دورِ حکومت میں اگر چہ ترکی زبان کا دور دورہ تھا لیکن اس نے بھی اپنی توزک فارسی زبان میں لکھوائی۔پھر نویں صدی ہجری کے آغاز میں میر شرف الدین علی یزدی (م: ۸۵۸ھ) کی 'ظفر نامۂ تیموری' (جسے ''ظفر نامۂ یزدی'' بھی کہا جاتا ہے۔) بھی انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہے۔ان کا انداز اور اسلوب بھی دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے ہے۔

دسویں صدی ہجری بھی فارسی نثر کی ترقی کی صدی ہے کہ اس صدی میں ترکوں کے بجائے صفوی خاندان کی حکومت قائم ہوئی، جنھوں نے علم وفن کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ مُلا حسین واعظ کاشفی (م:۹۱۰ھ) کی 'انوارِ سہیلی' میرا خوند شاہ کی 'روضہ الصفا' اور میر غیاث الدین کی 'حبیب السیر' وغیرہ اسی عہد کی یادگار ہیں۔ملا حسین واعظ کے بیٹے فخر الدین علی (م: ۹۳۹ھ) کی مزاحیہ حکایات پر مبنی تصنیف 'لطائف الطوائف' بھی اس دور کی اہم تصنیف ہے۔اسی طرح گیارھویں صدی ہجری میں سکندر منشی نے سلاطین صفویہ کی تاریخ 'عالم آرائے عباسی' کے نام سے لکھی، جس کی عبارت میں بڑا زور اور ایک شان ہے۔اسی صدی میں ملا رفیع واعظ قزوینی نے 'ابواب الجنان' لکھی جس کا موضوع اگر چہ مذہب ہے مگر عبارت کی رنگینی یہاں بھی برقرار ہے۔اسی دور میں ابراہیم عادل کی علم موسیقی کی کتاب کے تین دیباچوں پر مشتمل مجموعہ 'سہ نثر ظہوری' بھی منظر عام پر آیا۔پھر اسی عہد میں عاشقانہ خطوط کا ایک مجموعہ 'پنج رقعہ' ظہوری کی 'مینا باز ا' اور مرزا طاہر وحید وغیرہ کی خوش رنگ تحریروں کے نمونے ملتے ہیں۔یاد رہے کہ یہ دور ہندوستان میں اکبر و جہانگیر کا دور ہے۔یہاں ہمیں کہیں تو ابوالفضل 'اکبر نامہ' اور 'آئین اکبری' میں اپنا زورِ سخن دکھاتے نظر آتے ہیں۔پھر اسی صدی کے ذوق کی تسکین کے لیے کلیلہ ودِمنہ، مہا بھارت، رامائن اور سنگھاسن بتیسی کے فارسی ترجمے ہوتے نظر آتے ہیں۔اسی صدی میں جہانگیر کی 'توزک جہانگیری' شاہجہاں کے زمانے میں لکھی گئی 'بہار دانش'، متعدد 'شاہجہاں نامے' اور اورنگ زیب عالم گیر کی 'رقعاتِ عالم گیری' بھی فارسی نثر کے رنگا رنگ نمونے پیش کرتی ہیں۔ان تصانیف میں عبارت کی رنگینی، نازک خیالی اور تشبیہ واستعارہ کے برمحل استعمال نے فارسی نثر کو جگمگا دیا ہے۔

اسی طرح بارھویں اور تیرھویں صدی میں بھی فارسی نثر اسی ڈگر پر چلتی نظر آتی ہے، الفاظ وتراکیب اور تشبیہ واستعارہ کے پھریرے ہر طرف لہراتے نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے بعض مقامات پر رنگینی ولطافت اور شگفتگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔اگر کہیں مزاح کی صورت بھی نظر آتی ہے تو وہ اتفاقاً ہے یا لکھنے والے کے مزاج کی تاثیر۔مزاح برائے مزاح کے بالارادہ نمونے فارسی نثر میں شاذ ہی نظر آتے ہیں۔

جدید فارسی ادب میں طنز ومزاح

فارسی نثر کی تاریخ اگر چہ بہت قدیم ہے لیکن اس کا مجموعی مزاج زیادہ تر علمی وتحقیقی ہی رہا ہے۔ بہت ہوا تو ان موضوعات کی ثقالت اور یبوست دور کرنے کی خاطر بعض مصنفین نے لطائف وحکایات کا

سہارا لے لیا۔ فارسی نثر کی بیشتر اصناف کا آغاز تو ویسے ہی بیسویں صدی کے قریب آ کے ہوتا ہے۔ ان میں بھی بعض اصناف ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہیں۔

طنز و مزاح کا وہ سلسلہ جو زیادہ تر فارسی شعرا کی تربیت میں رہا، وہ خواجہ عصمت بخاری، حکیم شفائی، عرفی، شیدا فتح آبادی، طالب آملی (م: ۱۶۲۷ء)، نعمت خاں عالی (م: ۱۷۰۹ء) (یہ جعفر زٹلی کے دور کا شاعر ہے۔ جعفر سے اس کی چھیڑ چھاڑ کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔) قاآنی شیرازی (م: ۱۸۵۳ء) سید اشرف الدین اور میرزا غلام رضا خاں روحانی کی ظریفانہ نظموں سے ہوتا ہوا جدید دور کے شاعر نسیم شمال تک پہنچتا ہے، جسے پروفیسر علم الدین سالک 'ایران کا اکبرالہ آبادی' قرار دیتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے ملک کے سیاسی حالات اور ہمیشہ ذاتی مفادات کو عزیز رکھنے والوں کی اپنے اشعار میں خوب خبر لی ہے اور عبید زاکانی کے معروف مصرع ''روسخرگی پیشہ۔۔۔'' کی تضمین کے ذریعے مختلف طبقۂ فکر کے لوگوں کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔

جدید فارسی ادب میں بھی طنز و مزاح کا جیسا تیسا سلسلہ ہمیں نظم و نثر دونوں میں شانہ بشانہ چلتا نظر آتا ہے۔ ملک الشعرا بہار (م: ۱۹۵۱ء) کے ہاں بھی جو ایران کی آزادی خواہوں کی تحریک میں بھی باقاعدہ شامل رہے، نظم و نثر میں طنز و مزاح کی خاص کاٹ دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ پھر ایرج میرزا (م: ۱۹۲۴ء) جو خود بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، نے بھی اپنے دور کے بعض وزرا کی حماقتوں اور ہوس پرستیوں کا خوب مضحکہ اڑایا ہے۔ ان کی عارف قزوینی (م: ۱۹۳۳ء) کی مذمت میں لکھی گئی مثنوی 'عارف نامہ' بھی طنز و ہجو کا زبردست نمونہ ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی میں ایران کا ایک انقلابی شاعر محمد رضا شاہ عشقی (م: ۱۹۲۴ء) بقول انور مسعود: ''عشقی بیسویں صدی کے ربع اول کی صدائے احتجاج ہے۔'' (۱۵)

مشہور ہے کہ اس کے ہم نام ایرانی بادشاہ رضا شاہ نے اس کی طنزیہ نظموں سے تنگ آ کر شاعروں کو بھوکا ننگا کہا تو اس نے اگلے ہی دن جواب میں لکھا:

ہاں میں بھوکا ہوں، لیکن شیر کی طرح بھوکا
ہاں میں ننگا ہوں، لیکن تلوار کی طرح ننگا

عشقی کی اسی زہر خند طنز کی بنا پر حاکم وقت نے اسے بتیس برس کی عمر میں قتل کروا دیا۔ عشقی کے ساتھ فرخی یزدی (م: ۱۹۳۹ء) کا ذکر بھی ناگزیر ہے، جس کی تلخ نوائی کی بنا پر حاکم یزد نے اس کے دونوں ہونٹ سلوا دیے تھے۔ اسے جدید صحافتی طنز کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے عمر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے پرچے ''طوفان'' کے ذریعے ہمیشہ حاکم وقت کے خلاف نبرد آزما رہا۔ یہ پرچہ کوئی سولہ بار بند ہوا۔ بالآخر اس حق گو شاعر اور ادیب کو بھی نہ بکنے اور نہ جھکنے کی پاداش میں جیل میں زہر دے کر مروا دیا گیا۔

نثری طنز و مزاح کے حوالے سے جدید دور میں میرزا علی اکبر دہخدا (۱۲۹۷ھ ـ ـ ۱۳۷۵ھ) کا نام بھی نہایت اہم ہے۔ ان کے موضوعات مزاح کے علاوہ تحقیق، علم لغت، ترجمہ وغیرہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایران کی آزادی کی تحریک میں بھی ان کا نمایاں ہاتھ ہے۔ یورپ سے واپسی پر انھوں نے 'صور اسرافیل' کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا، جس میں یہ 'چرند پرند' کے عنوان سے فکاہی کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کے انھی کالموں نے نہ صرف جدید فارسی نثر میں ایک نئی روح پھونک دی اور فارسی صحافت کو ایک نیا موڑ دیا بلکہ جدید ایرانی معاشرے میں شعور کی رو تیز کرنے میں بھی ان کی تحریروں کو بہت دخل ہے۔ 'صور اسرافیل' ہی کے زمانے میں ایران سے اگرچہ کشکول، تنبیہہ، شیدا اور حشرات الارض نام کے فکاہی پرچے بھی نکلتے رہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی صور اسرافیل' جیسی مقبولیت اور اعتبار حاصل نہ ہو سکا۔

پھر فریدوں تو للّی (پ: ۱۹۲۷ء) ہیں جو نظم و نثر دونوں میدانوں کے مرد ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق عبید زاکانی کے بعد ان جیسا طناز فارسی ادب میں پیدا نہیں ہوا۔ انھی کے ہم عصروں میں رہی معیری (م: ۱۹۶۸ء) شہریار (پ: ۱۶۸۵ شمسی)، مہدی سہیلی اور ابوالقاسم حالت وغیرہ کے نام بھی اہم ہیں، بلکہ جدید دور کے مزاح گو شعرا میں ابوالقاسم حالت کا نام سب سے نمایاں ہے۔

اسی طرح جدید فارسی افسانے میں بھی طنز و مزاح کی کچھ نمایاں صورتیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ بیسوی صدی کے نصف اول میں صادق ہدایت (۱۹۰۳ـ ۱۹۵۱ء) اور سید محمد علی جمال زادہ (پ: ۱۳۰۹ھ) کے افسانوں میں شگفتگی کے نمایاں عناصر ملتے ہیں، جب کہ نئے زمانے میں مطیع الدولہ محمد حجازی (۱۹۰۰ء ـ ۱۹۷۴ء) فارسی مزاح کے ایک اہم نمایندہ ہیں۔ ان کی "مجلس عیادت" تو باقاعدہ طنز و مزاح کا ایک قابل ذکر نمونہ ہے، جس کا اردو میں خواجہ حمید یزدانی نے "چچّے" کے عنوان سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ موجودہ ایران میں ترکی کے معروف مزاح نگار عزیز نسیں کے تراجم بھی نہایت ذوق وشوق سے پڑھے جا رہے ہیں۔

آخر میں ایران سے جاری ہونے والے بعض مزید فکاہی پرچوں کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان پرچوں میں: حاجی بابا، بابا شمل، چنگر، توفیق، طلوع، جبل المتین، گل آقا، خورجین اور فکاہی وغیرہ کا فارسی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ میں نمایاں ہاتھ ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی 'توفیق' کی مدح میں رقم طراز ہیں:

> "جو حقیقت، توانائی، خوشی اور ظرافت ایرانی عوام کو "توفیق" سے حاصل ہوتی ہے، وہ کسی اور جگہ سے نہیں ہوتی۔" (۱۶)

ایران کے مزید نئے شگفتہ نگاروں میں علی اکبر اصفہانی، مسعود فرزاد، ناصر کرمانی، شیدا صفت، ابو تراب جلی، محمد خرمشاہی، فرخ خراسانی، سید تقی زادہ، محمد حاجی حسینی، عمران صلاحی، کمال اجتماعی، محمد علی معرفت، منوچہر مجوبی، پرویز نامدار اور مرتضیٰ فرجیان وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ (۱۷)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) شبلی نعمانی، شعر العجم (جلداول) مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۸۶

(۲) خواجہ حمید یزدانی، فارسی شاعری میں طنز و مزاح، نگارشات لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۵۲

(۳) شعر العجم (جلداول)، ص: ۲۶۱۔۲۶۲

(۴) ایضاً، ص: ۲۸۲

(۵) بعض لوگ اس معروف قطعے کو کمال الدین اسماعیل سے بھی منسوب کرتے ہیں۔

(۶) فارسی شاعری میں طنز و مزاح، ص: ۳۱۵

(۷) ایضاً، ص: ۳۵۰

(۸) ایضاً، ص: ۳۶۸

(۹) شعر العجم (جلد دوم)، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۲۰

(۱۰) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے پیمبران سخن از ایس۔ جے امام الدین، گنجینہ ادب، اسلام آباد ۱۹۶۷ء

(۱۱) شعر العجم (جلد دوم)، ص: ۱۸۰

(۱۲) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "سنجش و پژوہش" مضمون: حسن پناہی، شمارہ ۱۳، ۱۴، تہران ۔۱۳۸۸ شمسی

(۱۳) محمد حسین آزاد، سخندانِ فارس، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص: ۶۱

(۱۴) ایضاً، ص: ۳۷

(۱۵) انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، عاقب پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص: ۶۲

(۱۶) سرگذشت شگفت انگیز طنز مشمولہ "آشنا" شمارہ نمبر ۱۵، ۱۳۸۲ شمسی، ص: ۵۳

(۱۷) دیکھیے مزید تفصیل کے لیے مقالہ: طنز و فکاہی در ایران از "سنجش و پژوہش" تا "گل آقا" (ادارہ) اور "نیا ایرانی ادب" از ڈاکٹر ظہور الدین احمد۔

مآخذ

(۱) سخن دانِ فارس مولانا محمد حسین آزاد اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء

(۲) شعر العجم (پانچ جلدیں) علامہ شبلی نعمانی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

(۳) تاریخ فرشتہ (جلداول)، محمد قاسم فرشتہ (مترجم: عبدالحی خواجہ)، بک ٹاک میاں چیمبرز، لاہور، ۱۹۹۱ء

(۴) پیمبران سخن، پروفیسر ایس۔ جے امام الدین، گنجینۂ ادب سراج مارکیٹ، اسلام آباد، ۱۹۶۷ء

(۵) نیا ایرانی ادب، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، ضیائے ادب، لاہور، س۔ن

(۶) فارسی شاعری میں طنز و مزاح، خواجہ حمید یزدانی، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۹ء

(۷) اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، مکتبہ عالیہ لاہور (ششم)، ۱۹۹۳ء
(۸) فارسی زبان و ادب، ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء
(۹) ہندوستان میں فارسی ادب، ڈاکٹر نعیم الدین، نازیہ پرنٹرس، دہلی، ۱۹۸۵ء
(۱۰) جدید فارسی شاعری، ن م راشد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۴ء
(۱۱) فارسی ادب کے چند گوشے، انور مسعود، عاقب پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء
(۱۲) لطفاً لبخند بزنید، مرتضیٰ فرجیان (مرتبہ)، انتشارات، حافظ نوین، چاپ خانہ سلمان فارسی، تہران، ۱۳۷۱ھ
(۱۳) فارسی غزل اور اس کا ارتقا، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، مجلس تحقیق و تالیف فارسی گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۹۳ء
(۱۴) پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ ڈاکٹر ظہور الدین احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۴ء
(۱۵) فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ ڈاکٹر محمد ریاض / صدیق شبلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
(۱۶) پس پردہ گفتگویا، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی (مترجم)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
(۱۷) گلستان، شیخ مصلح الدین سعدی، مقبول اکیڈمی، لاہور، (مترجم عبدالباری آسی)، س۔ن
(۱۸) حکایاتِ رومی، مولوی جلال الدین رومی، فیروز سنز، لاہور، (ترجمہ و تہذیب: مقبول جہانگیر)، س۔ن
(۱۹) چون سبوی تشنه، دکتر محمد جعفر یاحقی، مشهد، (تاریخ ادبیات معاصر فارسی)، ۱۳۷۴ شمسی
(۲۰) دیداری با اهل قلم، دکتر غلام حسین یوسفی، دانش گاه فردوسی، مشهد، ۱۳۵۷
(۲۱) شعر فارسی از آغاز تا امروز، پروین شکیبا، هنرمند، تهران، ۱۳۷۰ شمسی
(۲۲) نقوش، (طنز و مزاح نمبر)، مدیر: محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو، لاہور، شمارہ نمبر ۱۷۲، جنوری فروری: ۱۹۵۹ء
(۲۳) شگفت انگیز طنز (مضمون)، آشنا، تہران، شمارہ نمبر ۱۵، بہمن و اسفند ۱۳۷۶ ش
(۲۴) سنجش و پژوهش، (طنز و مزاح نمبر)، تہران، شمارہ ۱۳، ۱۴، ۱۳۷۷ ش
(۲۵) دنیای سخن، ماہنامہ، تہران، شمارہ جات نمبر: ۲۳، ۳۵، ۳۷، ۱۳۲۹ ش

✿✿✿